خلافتِ راشدہ اور اُس کی خصوصیات

ابُوالاعلیٰ مودُودی

اس سے پہلے اِن صفحات میں اسلام کے جو اصولِ حکمرانی بیان کیے جا چکے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کی حکومت انہی اصولوں پر قائم ہوئی تھی۔ آنحضرتؐ کی براہِ راست تعلیم و تربیت اور عملی رہنمائی سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی رُوح کے مطابق کس قسم کا نظامِ حکومت بننا چاہیے۔ اگرچہ آنحضرتؐ نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوریٰ خلافت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنا ڈالی گئی، نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسرِ اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لیے خود کوئی دوڑ دھوپ، یا برائے نام بھی کوئی کوشش کی، بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو اُمّت نے خلافتِ راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔

انتخابی خلافت | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اُس وقت پورے مُلک میں عملاً نمائندہ حیثیت رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمرؓ کے حق میں وصیت لکھوائی اور پھر مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے کہا:

"کیا تم اُس شخص پر راضی ہو جسے میں اپنا جانشین بنا رہا ہوں؟ خدا کی قسم میں نے

راتے قائم کرنے کے لیے اپنے ذہن پر زور ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں بلکہ عمر بن الخطاب کو جانشین مقرر کیا ہے، لہٰذا تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔“

اس پر لوگوں نے کہا ”ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔“[۱۰]

حضرت عمرؓ کی زندگی کے آخری سال حج کے موقع پر ایک شخص نے کہا کہ ”اگر عمرؓ کا انتقال ہوا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا، کیونکہ ابوبکرؓ کی بیعت بھی تو اچانک ہی ہوئی تھی اور آخر وہ کامیاب ہو گئی۔“[۱۱] حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا میں اس معاملہ پر ایک تقریر کروں گا اور ”عوام کو اُن لوگوں سے خبردار کر دُوں گا جو اُن کے معاملات پر غاصبانہ تسلط قائم کرنے کے ارادے کر رہے ہیں۔“ چنانچہ مدینے پہنچ کر انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں اس قصّے کا ذکر کیا اور بڑی تفصیل کے ساتھ سقیفۂ بنی ساعدہ کی سرگزشت بیان کر کے یہ بتایا کہ اُس وقت مخصوص حالات تھے جن میں اچانک حضرت ابوبکرؓ کا نام تجویز کر کے مَیں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرمایا: اگر ہم ایسا نہ کرتا اور خلافت کا تصفیہ کیے بغیر ہم لوگ مجلس سے اُٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لیے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل۔ یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آئندہ کے لیے نظیر نہیں بنایا جا سکتا۔ تم میں ابوبکر جیسی بلند و بالا اور مقبول شخصیت کا آدمی اور کون ہے۔ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی، دونوں اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کریں گے۔“[۱۲]

---

۱۰ الطّبری، تاریخ الأمم والملوک، ج ۲، ص ۶۱۸، المطبعۃ الاستقامہ، قاہرہ، ۱۹۳۹

۱۱ اُس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حضرت عمرؓ نے سقیفۂ بنی ساعدہ کی مجلس میں اچانک اُٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کا نام تجویز کیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر فوراً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ان کو خلیفہ بنانے کے معاملے میں پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔

۱۲ بخاری، کتاب المحاربین، باب ۱۶۔ مسند احمد، ج ۱، حدیث نمبر ۳۹۱، طبع ثالث، دار المعارف مصر، ۱۹۴۹ء، مسند احمد

اپنے تشریح کردہ اسی قاعدے کے مطابق حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک انتخابی مجلس مقرر کی اور فرمایا: "جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر زبردستی امیر بننے کی کوشش کرے اسے قتل کردو"۔ اس کے ساتھ انہوں نے اپنے بیٹے کو خلافت کے استحقاق سے صاف الفاظ میں مستثنیٰ کردیا تاکہ خلافت ایک موروثی منصب نہ بن جائے۔[۴] یہ انتخابی مجلس اُن چھ اشخاص پر مشتمل تھی جو حضرت عمرؓ کے نزدیک قوم میں سب سے زیادہ بااثر اور مقبول عام تھے۔

اس مجلس نے آخر کار اپنے ایک رکن، عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو خلیفہ تجویز کرنے کا اختیار دے دیا۔ انہوں نے عام لوگوں میں چل پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ عوام کا رجحان زیادہ تر کس شخص کی طرف ہے۔ حج سے واپس گزرتے ہوئے قافلوں سے بھی دریافت کیا۔ اور اس استصواب عام سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اکثر لوگ حضرت عثمانؓ کے حق میں ہیں۔[۵] اسی بنیاد پر حضرت عثمانؓ خلافت کے لیے منتخب کیے گئے اور مجمعِ عام میں ان کی بیعت ہوئی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو انہوں نے کہا: "تمہیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کے کرنے کا کام ہے۔ جس کو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر خلیفہ بنانا چاہیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے

کی اِس روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں: "جس شخص نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ اس شخص کی کوئی بیعت ہے جس سے اس نے بیعت کی"۔ ایک اور روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ بھی آئے ہیں کہ "جس شخص کو مشورے کے بغیر امارت دی جائے اس کے لیے اس کا قبول کرنا حلال نہیں ہے" (ابنِ حجر، فتح الباری، ج ۲، ص ۱۲۵، المطبعۃ الخیریہ، قاہرہ ۱۳۲۵ھ)

۴؎ الطبری، ج ۳، ص ۲۹۲۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۳۴، ۳۵، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۵۶ھ۔

۵؎ حوالہ مذکور، نیز ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۲۳، مطبعۃ الفتوح، مصر، ۱۳۳۱ھ۔

پر غور کریں گے۔[۶] طبری کی روایت میں حضرت علیؓ کے الفاظ یہ ہیں: "میری بیعت خفیہ طریقہ سے نہیں ہو سکتی۔ یہ مسلمانوں کی مرضی سے ہی ہونی چاہیئے۔"[۷]

حضرت علیؓ کی وفات کے وقت لوگوں نے پوچھا کہ ہم آپ کے صاحبزادے حضرت حسن کے ہاتھ پر بیعت کریں؟ آپ نے جواب میں کہا "میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں، تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔"[۸] ایک شخص نے عین اُس وقت جبکہ آپ اپنے صاحبزادوں کو آخری وصیت کر رہے تھے، عرض کیا کہ امیر المومنین آپ اپنا ولی عہد کیوں نہیں مقرر کر دیتے۔ جواب میں فرمایا "میں مسلمانوں کو اُسی حالت میں چھوڑوں گا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے چھوڑا تھا۔"[۹]

ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے متعلق خلفائے راشدین اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا متفق علیہ تصوّر یہ تھا کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیے۔ موروثی، یا طاقت سے برسرِ اقتدار آنے والی امارت ان کی رائے میں صحیح نہ تھی۔

شوُروی حکومت یہ چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملے میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ کیے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔ سُنن الدارمی میں حضرت میمون بن مہران کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر کا قاعدہ یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا تو پہلے یہ دیکھتے تھے کہ اس معاملہ میں کتاب اللہ کیا کہتی ہے۔ اگر وہاں کوئی حکم نہ ملتا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح کے معاملہ میں کیا فیصلہ فرمایا ہے۔ اور اگر سنّتِ رسول میں بھی کوئی حکم نہ ملتا تھا تو قوم کے سرکردہ اور نیک لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کرتے تھے، پھر جو رائے

---

[۶] ابن قتیبہ، ج ۱، ص ۴۱

[۷] الطبری، ج ۳، ص ۴۵۰

[۸] الطبری، ج ۴، ص ۱۱۲۔ المسعودی، مُرُوجُ الذّہب۔ ج ۲، ص ۴۲، المطبعۃ البہیۃ مصر ۱۳۴۶ھ

[۹] المسعودی، ج ۲ ص ۴۲۔

بھی سب کے مشورے سے قرار پاتی تھی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے[10]۔ یہی طرزِ عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی تھا[11]۔

مشورے کے معاملے میں خلفائے راشدین کا تصور یہ تھا کہ اہلِ شوریٰ کو پوری آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے کرنے کا حق ہے۔ اس معاملے میں خلافت کی پالیسی کو حضرت عمرؓ نے ایک مجلسِ مشاورت کی افتتاحی تقریر میں یوں بیان فرمایا ہے:

> "میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لیے تکلیف دی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی لوگ وہ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں[12]۔"

بیت المال کے امانت ہونے کا تصور بیت المال کو وہ خدا اور خلق (PUBLIC) کی امانت سمجھتے تھے۔ اس میں قانون کے خلاف کچھ آنے سے اور اس میں سے کچھ خرچ ہونے کو وہ جائز نہ رکھتے تھے۔ فرمانرواؤں کی ذاتی اغراض کے لیے اس کا استعمال ان کے نزدیک حرام تھا۔ حضرت ابوبکرؓ جس روز خلیفہ ہوئے اس کے دوسرے دن کندھے پر کپڑے کے تھان رکھ کر بیچنے کے لیے نکلے (خلافت سے پہلے یہی ان کا ذریعہ معاش تھا)، راستے میں حضرت عمرؓ ملے اور انہوں نے کہا یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ جواب دیا، اپنے بال بچوں کو کہاں سے کھلاؤں؟ انہوں نے کہا، اب آپ کے اوپر مسلمانوں کی سربراہ کاری کا بار آ پڑا ہے۔ یہ کام اس کے ساتھ نہیں نبھ سکتا۔ چلیے، ابوعبیدہ (ناظم بیت المال) سے مل کر بات کرتے

۱۰؎ سنن الدارمی، باب الفتیا وما فیہ من الشدۃ

۱۱؎ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۲۸۱

۱۲؎ امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۲۵۔

ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ سے گفتگو کی گئی۔ انہوں نے کہا ہم آپ کے لیے مہاجرین میں سے ایک عام آدمی کی آمدنی کا معیار سامنے رکھ کر ایک وظیفہ مقرر کیے دیتے ہیں جو نہ ان کے سب سے زیادہ دولتمند کے برابر ہو گا نہ سب سے غریب کے برابر۔ اس طرح ان کے لیے ایک وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو تقریباً ۴ ہزار درہم سالانہ تھا۔ مگر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ میرے ترکے میں سے ۸ ہزار درہم بیت المال کو واپس کر دیئے جائیں۔ یہ مال جب حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا تو انہوں نے کہا، خدا ابوبکر پر رحمت فرمائے، اپنے بعد آنے والوں کو انہوں نے مشکل میں ڈال دیا۔[۱۳]

حضرت عمرؓ اپنی ایک تقریر میں بیان کرتے ہیں کہ بیت المال میں خلیفہ کا کیا حق ہے:

"میرے لیے اللہ کے مال میں سے اس کے سوا کچھ حلال نہیں ہے کہ ایک جوڑا کپڑا گرمی کے لیے اور ایک جاڑے کے لیے اور قریش کے ایک اوسط آدمی کے برابر معاش اپنے گھر والوں کے لیے لے لوں۔ پھر میں بس ایک آدمی ہوں مسلمانوں میں سے۔[۱۴]"

ایک اور تقریر میں وہ فرماتے ہیں:

"میں اس مال کے معاملہ میں تین باتوں کے سوا کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا۔ حق کے ساتھ لیا جائے۔ حق کے مطابق دیا جائے۔ اور باطل سے اس کو روکا جائے۔ میرا تعلق تمہارے اس مال کے ساتھ وہی ہے جو یتیم کے ولی کا تعلق یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میں محتاج نہ ہوں تو اس میں سے کچھ نہ لوں گا اور اگر محتاج ہوں تو معروف طریقے پر کھاؤں گا۔[۱۵]"

حضرت علی کا جس زمانے میں حضرت معاویہؓ سے مقابلہ درپیش تھا، لوگوں نے ان کو مشورہ

---

[۱۳] کنز العمال، ج ۵، ح ۲۲۸۰ - ۲۲۸۵

[۱۴] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۱۳۴۔ مطبعۃ السعادہ، مصر۔

[۱۵] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۱۷۔

دیا کہ جس طرح حضرت معاویہ لوگوں کو بے تحاشا انعامات اور عطیے دے دے کر اپنا ساتھی بنا رہے ہیں آپ بھی بیت المال کا منہ کھولیں اور روپیہ بہا کر اپنے حامی پیدا کریں۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا کہ "کیا تم چاہتے ہو میں ناروا طریقوں سے کامیابی حاصل کروں؟"[۱۶] ان سے خود ان کے بھائی حضرت عقیلؓ نے چاہا کہ وہ بیت المال سے ان کو روپیہ دیں، مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی مسلمانوں کا مال تمہیں دے کر جہنم میں جائے؟[۱۷]

حکومت کا تصور ان لوگوں کا تصورِ حکومت کیا تھا، فرمانروا ہونے کی حیثیت سے یہ اپنے مقام اور اپنے فرائض کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے۔ اور اپنی حکومت میں کس پالیسی پر عامل تھے۔ ان چیزوں کو انہوں نے خود خلافت کے منبر سے تقریریں کرتے ہوئے برسرِ عام بیان کر دیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کی پہلی تقریر جو انہوں نے مسجدِ نبوی میں عام بیعت کے بعد کی، اس میں وہ کہتے ہیں:

"میں آپ لوگوں پر حکمراں بنایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ کا سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں لیا ہے۔ نہ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کے بجائے یہ مجھے ملے۔ نہ میں نے کبھی خدا سے اس کے لیے دُعا کی۔ نہ میرے دل میں کبھی اس کی حرص پیدا ہوئی۔ میں نے تو اسے بادلِ ناخواستہ اس لیے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں فتنۂ اختلاف اور عرب میں فتنۂ ارتداد برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میرے لیے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بارِ عظیم ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے، جس کے اٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے، اِلّا یہ کہ اللہ ہی میری مدد فرمائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بار اٹھائے۔ اب بھی اگر آپ لوگ چاہیں تو اصحابِ رسول اللہ میں سے کسی اور کو اس کام کے لیے چن لیں، میری بیعت آپ کے راستے میں حائل نہ ہوگی۔ آپ لوگ

۱۶؎ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱ ص ۱۸۲، دار الکتب العربیہ، مصر، ۱۳۲۹ھ

۱۷؎ ابنِ قتیبہ، الامامہ والسیاسہ۔ ج ۱، ص ۷۱۔

اگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار پر جانچیں گے اور مجھ سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضور سے آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجیے، اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجیے۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں اگر خدا چاہے۔ اور تم میں سے جو طاقت ور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں اگر خدا چاہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جدوجہد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کر دے، اور کسی قوم میں فواحش پھیلیں اور اللہ اس کو عام مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔ میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول کا مطیع رہوں۔ اور اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔ میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں[۱۸]۔"

حضرت عمرؓ اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

"لوگو، کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے ... لوگو میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں وہ میں تم سے بیان کیے دیتا ہوں، ان پر تم مجھے پکڑ سکتے ہو۔ میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج یا اللہ کے عطا کردہ فے میں سے کوئی چیز نہ وصول کروں مگر قانون کے مطابق، اور میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ جو کچھ مال اس طرح میرے پاس آئے اس میں سے کچھ نہ نکلے مگر حق کے مطابق[۱۹]۔"

۱۸؎ الطبری، ج ۲، ص ۴۵۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج ۴ ص ۳۱۱۔ مطبعۃ مصطفی البابی، مصر ۱۹۳۶ء۔ کنز العمال، ج ۵، احادیث نمبر ۲۲۶۱-۲۲۶۴-۲۲۶۸-۲۲۷۸-۲۲۹۱-۲۲۹۹-

۱۹؎ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۱۷۔

حضرت ابوبکرؓ جب شام و فلسطین کی مہم پر حضرت عمرو بن العاص کو روانہ کر رہے تھے، اس وقت انہوں نے جو ہدایات ان کو دیں ان میں وہ فرماتے ہیں:

"اے عمرو، اپنے کھلے اور چھپے ہر کام میں خدا سے ڈرتے رہو اور اس سے حیا کرو، کیونکہ وہ تمہیں اور تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے۔ ... آخرت کے لیے کام کرو اور اپنے ہر عمل میں خدا کی رضا کو پیشِ نظر رکھو۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ جیسے وہ تمہاری اولاد ہیں۔ لوگوں کے راز نہ ٹٹولو اور ان کے ظاہر پر ہی ان سے معاملہ کرو۔ ... اپنے آپ کو درست رکھو، تمہاری رعیت بھی درست رہے گی"[۱۲]

حضرت عمرؓ جن لوگوں کو عامل بنا کر کہیں بھیجتے تھے ان کو خطاب کر کے کہتے:

"میں تم لوگوں کو امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے عامل مقرر نہیں کر رہا ہوں کہ تم ان کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک بن جاؤ بلکہ میں اس لیے تمہیں مقرر کرتا ہوں کہ تم نماز قائم کرو، لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور عدل کے ساتھ ان کے حقوق تقسیم کرو"[۱۳]

ایک مرتبہ انہوں نے برسرِ عام اعلان کیا کہ "میں نے اپنے عاملوں کو اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ وہ تم لوگوں کو پیٹیں اور تمہارے مال چھینیں، بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کا طریقہ سکھائیں۔ جس شخص کے ساتھ اس کے خلاف عمل کیا گیا ہو وہ میرے پاس شکایت لائے۔ خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا"۔ اس پر حضرت عمرو بن العاص (مصر کے گورنر) نے اٹھ کر کہا "اگر کوئی شخص مسلمانوں کا والی ہو اور تادیب کی غرض سے کسی کو مارے تو کیا آپ اس سے بدلہ لیں گے؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "ہاں، خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا۔ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے"[۱۴]

---

[۱۲] کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۱۳ [۱۳] الطبری، ج ۳، ص ۲۷۳

[۱۴] ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۱۵۔ مسند ابو داؤد الطیالسی، حدیث نمبر ۵۵۔ ابن الاثیر ج ۳، ص ۳۰۔ الطبری ج ۳، ص ۲۷۳۔

ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے تمام گورنروں کو حج میں طلب کیا اور مجمع عام میں کھڑے ہو کر کہا کہ ان لوگوں کے خلاف جس شخص کو کسی ظلم کی شکایت ہو وہ پیش کرے۔ پورے مجمع میں صرف ایک شخص اٹھا اور اس نے عمروؓ بن العاص کی شکایت کی کہ انہوں نے ناروا طور پر مجھے سو کوڑے لگوائے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اٹھو اور ان سے اپنا بدلہ لے لو۔ عمروؓ بن العاص نے احتجاج کیا کہ آپ گورنروں پر یہ دروازہ نہ کھولیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے آپ سے بدلہ دیتے دیکھا ہے، اے شخص اٹھ اور اپنا بدلہ لے لے۔" آخر کار عمروؓ بن العاص کو ہر کوڑے کے بدلے دو اشرفیاں دے کر اپنی پیٹھ بچانی پڑی۔[۲۳]

قانون کی بالاتری یہ خلفاء اپنی ذات کو بھی قانون سے بالاتر نہیں رکھتے تھے بلکہ قانون کی نگاہ میں اپنے آپ کو اور مملکت کے ایک عام شہری (مسلمان ہو یا ذمّی) کو مساوی قرار دیتے تھے۔ قاضیوں کو اگرچہ رئیسِ مملکت ہونے کی حیثیت سے وہی مقرر کرتے تھے، مگر ایک شخص قاضی ہو جانے کے بعد خود اُن کے خلاف فیصلہ دینے میں بھی ویسا ہی آزاد تھا جیسا کسی عام شہری کے معاملہ میں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اور حضرت اُبَیؓ بن کعب کا ایک معاملے میں اختلاف ہو گیا اور دونوں نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو حَکَم بنایا۔ فریقین زید کے پاس حاضر ہوئے۔ زید نے اُٹھ کر حضرت عمرؓ کو اپنی جگہ بٹھانا چاہا، مگر حضرت عمرؓ حضرت اُبَیؓ کے ساتھ بیٹھے۔ پھر حضرت اُبَیؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور حضرت عمرؓ نے دعوے سے انکار کیا۔ قاعدے کے مطابق حضرت زید کو حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہیے تھی، مگر انہوں نے اُن سے قسم لینے میں تامل کیا۔ حضرت عمرؓ نے خود قسم کھائی، اور اس مجلس کے خاتمہ پر کہا "زید قاضی ہونے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک کہ عمرؓ اور ایک عام مسلمان ان کے نزدیک برابر نہ ہو۔"[۲۴]

ایسا ہی معاملہ حضرت علیؓ کا ایک عیسائی کے ساتھ پیش آیا جس کو انہوں نے کوفہ کے بازار میں اپنی گم شدہ زرہ بیچتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے امیر المومنین ہونے کی حیثیت سے اپنی

۲۳۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۱۶

۲۴۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، ج ۱۰، ص ۱۳۶، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، طبع اول ۱۳۵۵ھ

زرہ اُس سے چھین نہیں لی، بلکہ قاضی کے پاس استغاثہ کیا۔ اور چونکہ وہ کوئی شہادت پیش نہ کر سکے اس لیے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا۔[25]

ابنِ خلکان کی روایت ہے کہ ایک مقدمہ میں حضرت علی اور ایک ذمی فریقین کی حیثیت سے قاضی شُریح کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی نے اُٹھ کر حضرت علیؓ کا استقبال کیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا " یہ تمہاری پہلی بے انصافی ہے[26]"۔

عصبیتوں سے پاک حکومت | اسلام کے ابتدائی دور کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس زمانے میں ٹھیک ٹھیک اسلام کے اصول اور اس کی رُوح کے مطابق قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کے درمیان یکساں سلوک کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں ایک طوفان کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ مدعیانِ نبوت کے ظہور اور ارتداد کی تحریک میں یہی عامل سب سے زیادہ مؤثر تھا۔ مُسیلمہ کے ایک پیرو کا قول تھا کہ " مَیں جانتا ہوں مُسیلمہ جھوٹا ہے مگر ربیعہ کا جھوٹا مُضر کے سچے سے اچھا ہے[27]"۔ ایک دوسرے مدعیٔ نبوت طُلیحہ کی حمایت میں بنی غطفان کے ایک سردار نے کہا تھا کہ " خدا کی قسم، اپنے حلیف قبیلوں کے ایک نبی کی پیروی کرنا قریش کے نبی کی پیروی سے مجھ کو زیادہ محبوب ہے[28]"۔ مگر اس ماحول میں جب حضرت ابوبکرؓ (۱۱-۱۳ھ ۶۳۲-۶۳۴ء) اور ان کے بعد حضرت عمرؓ (۱۳-۲۳ھ ۶۳۴-۶۴۴ء) نے بے لاگ اور غیر منصفانہ طریقے سے نہ صرف تمام عرب قبائل، بلکہ غیر عرب نومسلموں کے ساتھ بھی منصفانہ برتاؤ کیا، اور خود اپنے خاندان اور قبیلے کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے سے قطعی مجتنب رہے، تو ساری عصبیتیں دب گئیں اور مسلمانوں میں وہ بین الاقوامی روح اُبھر آئی جس کا اسلام تقاضا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے ان

---

[25] حوالہ مذکور

[26] وفیات الاعیان، ج ۲، ص ۱۶۸، مکتبۃ النہضۃ المصریہ، قاہرہ ۱۹۴۸ء

[27] الطبری، ج ۲، ص ۵۰۸

[28] ایضاً، ج ۲، ص ۴۸۷

دونوں خلفاء کا طرزِ عمل درحقیقت مثالی تھا

حضرت عمرؓ کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ان کے بعد عرب کی یہ قبائلی عصبیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود بالکل ختم نہیں ہو گئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور ان کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا: "اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کردوں تو وہ بنی ابی مُعَیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کردیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمانؓ یہی کریں گے، اور اگر عثمان نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمانؓ کو قتل کردیں گے[۲۹]۔" اسی چیز کا خیال ان کو اپنی وفات کے وقت بھی تھا۔ چنانچہ آخری وقت میں انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو بلا کر ہر ایک سے کہا کہ "اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا[۳۰]۔" مزید برآں چھ آدمیوں کی انتخابی شوریٰ کے لیے انہوں نے جو ہدایات چھوڑیں ان میں دوسری شرطوں کے ساتھ ایک شرط یہ بھی شامل کی کہ منتخب خلیفہ سے عہد لیا جائے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا[۳۱]۔ مگر بدقسمتی سے خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ (۳۵-۲۳ھ- ۶۵۶-۶۴۴ء) اس معاملے میں معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ ان کے عہد میں بنی امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے وظیفے دیئے گئے اور دوسرے قبیلے اسے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے۔ اُن کے نزدیک یہ صلۂ رحمی کا تقاضا تھا، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ "عمر خدا کی خاطر اپنے اقربا کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں[۳۲]۔" ابوبکرؓ و عمرؓ بیت المال کے معاملہ میں اس بات کو پسند کرتے

---

[۲۹] ابن عبدالبر، الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۶۷، دائرۃ المعارف حیدر آباد، طبع دوم

[۳۰] الطبری، ج ۳، ص ۲۶۴ [۳۱] ابن قُتَیبہ، الامامۃ والسیاسہ، ج ۱، ص ۲۵

[۳۲] الطبری ج ۳، ص ۲۹۱

تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقربا کو بھی اسی حالت میں رکھیں۔ مگر میں اس میں صلۂ رحمی کرنا پسند کرتا ہوں[۳۳]"۔ اس کا نتیجہ آخر کار وہی ہوا جس کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور صرف یہی نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے، بلکہ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں جن کا شعلہ خلافتِ راشدہ کے نظام ہی کو پھونک کر رہا۔

حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ (۳۵ - ۴۰ھ ۶۵۶ - ۶۶۱ء) نے پھر اسی معیار پر کام کرنے کی کوشش کی جو حضرت ابوبکر و عمر نے قائم کیا تھا۔ وہ قبائلی تعصب سے بالکل پاک تھے۔ حضرت معاویہؓ کے والد حضرت ابوسفیانؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے وقت اُن کے اندر اس تعصب کی رُوح کو اُبھارنے کی کوشش کی تھی، مگر انہوں نے یہ راہ اختیار کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ابوسفیان نے ان سے کہا تھا کہ "قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی (ابوبکرؓ) کیسے خلیفہ بن گیا، تم اُٹھنے کے لیے تیار ہو تو مَیں وادی کو سواروں اور پیدلوں سے بھر دوں"۔ مگر انہوں نے صاف جواب دے دیا کہ "تمہاری یہ بات اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے۔ مَیں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم کوئی سوار اور پیادے لاؤ۔ مسلمان سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں، خواہ ان کے دیار اور ان کے اجسام ایک دوسرے سے کتنے ہی دُور ہوں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ابوبکرؓ کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اہل نہ ہوتے تو ہم لوگ کبھی انہیں اس پر مامور نہ ہونے دیتے[۳۴]"۔ یہی حضرت علیؓ کا نقطۂ نظر خلیفہ ہونے کے بعد بھی رہا۔ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ٹھیک اسلامی اصول کے مطابق عربی اور عجمی، شریف اور وضیع، ہاشمی اور غیر ہاشمی، سب کے ساتھ یکساں انصاف کا معاملہ کرنا شروع کیا اور کسی گروہ کو کسی دوسرے گروہ کے مقابلے میں ایسے ترجیحی سلوک سے نوازنا پسند نہ کیا جو دوسرے گروہوں میں رشک و رقابت کے جذبات اُبھار دینے والا ہو۔

۳۳۔ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۲۴

۳۴۔ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۳۷۴۔ الطبری، ج ۲، ص ۴۴۹۔ ابن عبد البر، الاستیعاب ج ۲، ۶۸۹

رُوحِ جمہوریت اِس خلافت کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس میں تنقید اور اظہارِ رائے کی پوری آزادی تھی اور خلفاء ہر وقت اپنی قوم کی دسترس میں تھے۔ وہ خود اپنے اہلِ شوریٰ کے درمیان بیٹھتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ اُن کی کوئی سرکاری پارٹی نہ تھی، نہ اُن کے خلاف کسی پارٹی کا کوئی وجود تھا۔ آزادانہ فضا میں ہر شریکِ مجلس اپنے ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیتا تھا۔ تمام معاملات اہلِ حلّ وعقد کے سامنے بے کم و کاست رکھ دیئے جاتے اور کچھ چھپا کر نہ رکھا جاتا۔ فیصلے دلیل کی بنیاد پر ہوتے تھے نہ کہ کسی کے رُعب و اثر، یا کسی کے مفاد کی پاسداری، یا کسی جتھہ بندی کی بنیاد پر۔ پھر، یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطہ ہی سے نہ کرتے تھے، بلکہ براہِ راست ہر روز پانچ مرتبہ نماز با جماعت میں، ہر ہفتے ایک دفعہ جمعہ کے اجتماع میں، ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں اُن کو قوم سے اور قوم کو اُن سے سابقہ پیش آتا تھا۔ اُن کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب و دربان کے بغیر اُن کے دروازے ہر شخص کے لیے کھُلے ہوئے تھے۔ وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے، اور ہٹو بچو کے اہتمام کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ اِن تمام مواقع پر ہر شخص کو انہیں ٹوکنے، ان پر تنقید کرنے، اور ان سے محاسبہ کرنے کی کھلی آزادی تھی، اور اس آزادی کے استعمال کی وہ محض اجازت ہی نہ دیتے تھے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کی پہلی ہی تقریر میں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو میری مدد کرو، اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں اِس رائے کا اظہار کیا کہ کسی شخص کو نکاح میں چار سو درہم سے زیادہ مہر باندھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ایک عورت نے انہیں وہیں ٹوک دیا کہ آپ کو ایسا حکم دینے کا حق نہیں ہے۔ قرآن، ڈھیر سا مال (قنطار) مہر میں دینے کی اجازت دیتا ہے۔ آپ اس کی حد مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔[۵۵] ایک اور موقع پر بھرے مجمع میں حضرت سلمان فارسیؓ نے

---

[۵۵] تفسیر ابن کثیر، بحوالہ ابویعلیٰ و ابن المنذر، جلد اوّل، ص ۴۶۷

اُن سے محاسبہ کیا کہ سب کے حصے میں ایک ایک چادر آئی ہے، آپ نے دو چادریں کیسے لیں؟ حضرت عمرؓ نے اُسی وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کی شہادت پیش کر دی کہ دوسری چادر انہوں نے اپنے والد کو مستعار دی ہے۔[۳۵] ایک دفعہ اپنی مجلس میں انہوں نے لوگوں سے پوچھا، اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کر لوں تو تم کیا کرو گے۔ حضرت بشر بن سعد نے کہا اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کر دینگے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تب تو تم کام کے لوگ ہو۔[۳۶] سب سے زیادہ سخت تنقیدوں سے حضرت عثمانؓ کو سابقہ پیش آیا، اور انہوں نے کبھی کسی کا منہ زبردستی بند کرنے کی کوشش نہ کی، بلکہ ہمیشہ اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب میں برسرِعام اپنی صفائی پیش کی۔ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں خوارج کی انتہائی بدزبانیوں کو بڑے ٹھنڈے دل سے برداشت کیا۔ ایک مرتبہ پانچ خارجی ان کے پاس گرفتار کر کے لائے گئے جو علی الاعلان ان کو گالیاں دے رہے تھے اور ان میں سے ایک برسرِعام کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میں علیؓ کو قتل کر دونگا۔ مگر حضرت علیؓ نے ان سب کو چھوڑ دیا اور اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ ان کی بدزبانی کا جواب تم چاہو تو بدزبانی سے دے لو، مگر جب تک وہ عملاً کوئی باغیانہ کارروائی نہیں کرتے محض زبانی مخالفت کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے۔[۳۸]

خلافتِ راشدہ کا یہ دَور جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ایک روشنی کا مینار تھا جس کی طرف بعد کے تمام اَدوار میں فقہاء و محدثین اور عام دیندار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اسی کو اسلام کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملہ میں معیار سمجھتے رہے۔

۳۶؎ الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ، للمحب الطبری، جلد ۲، ص ۵۶ طبع مصر۔ سیرۃ عمر بن الخطاب لابن الجوزی، ص ۱۲۷۔

۳۷؎ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۴۱۴ ۔ ۳۸؎ المبسوط للسرخسی، ج ۱۰، ص ۱۲۵